مَلاكُ التأوِيل (۲)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص و ترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سورة البقرة

(۴) آیت ۱: ﴿الٓمّٓ ①﴾

میں توفیقِ الٰہی سے عرض کرتا ہوں کہ سورتوں کے شروع میں حروفِ مقطّعات کے بارے میں جو اقوال بیان کیے گئے ہیں وہ اپنی کثرت کے باوجود صرف دو باتوں میں منحصر ہیں۔

اوّل: ان کی تاویل نہ کی جائے بلکہ ان پر ایسے ہی ایمان لایا جائے جیسے وہ وارد ہوئے ہیں' بلکہ ان کے بارے میں بات نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

دوم: زبانِ عرب کے اعتبار سے ان کی تاویل کی جائے۔ یہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی کو ہم حق سمجھتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ عربوں کو قرآن جیسی کتاب یا اس کی سورتوں جیسی سورت یا اس کی آیات جیسی آیت لانے کا چیلنج دیا گیا تھا اور پھر یہ کہ وہ لوگ اہل زبان تھے اور اس کے باوجود اس چیلنج کو پورا نہ کر سکے اور یوں ان پر اور تمام مخلوقات پر حجت قائم ہوگئی۔ اور جب ہم نے اس بات کو تسلیم کر لیا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قرآن میں ایسے الفاظ کیسے آ گئے جو ان کے فہم سے باہر تھے؟ ایسی کوئی بات ہوتی تو عرب اس دلیل کو فوراً پیش کرتے کہ جب قرآن میں ایسے حروف یا الفاظ ہیں جو نا قابل فہم ہیں تو ہم اس کا مثل کہاں سے لائیں؟

چنانچہ مفسرین نے ان کے معانی و مطالب پر بہت کچھ لکھا ہے' اور جو بات ہم کہنے جا رہے ہیں' بہت کم لوگوں نے اسے سمجھا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت مقصود نہیں کہ یہ حروف کہیں صرف ایک ہیں' کہیں دو یا اس سے زیادہ' بلکہ پانچ تک مذکور ہیں' اور یہ کہ یہ صرف چودہ حروف ہی کیوں ہیں جن کا بار بار ذکر کیا گیا ہے اور یہ کہ ان میں سے اکثر تین تین حروف کا مجموعہ ہیں۔ یہ ساری باتیں اس کتاب کا مقصد نہیں ہیں۔

اس تمہید کے بعد گزارش ہے کہ یہ حروف جس جس سورت کے ساتھ آئے ہیں اُسی کے ساتھ خاص ہیں۔ الم کو المر کی جگہ پر یا حم کو طس کی جگہ پر یا ن کو ق کی جگہ پر نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ حروف سورت کے افتتاحی کلمات یا مطلع کی حیثیت رکھتے ہیں' گویا یہ ان کے نام ہیں اور بغیر کسی فرق کے ناموں ہی کی طرح انہیں سمجھنا چاہیے' حالانکہ بعض لوگوں نے انہیں نام ہی قرار دیا ہے۔ عربوں کی عادت تھی کہ نام رکھتے وقت وہ مُسمّٰی

(جس کا نام رکھا جا رہا ہے) کی کوئی نادر اور یکتا صفت کو یا اس کے انتہائی نمایاں اخلاقی پہلو کو دیکھتے اور اسے ہی اس چیز کا نام قرار دے دیتے۔ اسی طرح نثر و نظم میں کسی امتیازی جملے یا قصیدہ کے مطلع ہی کو نام کے لیے چن لیتے۔ کتابِ الٰہی میں بھی سورتوں کے نام اسی طرح رکھے گئے ہیں۔ اب دیکھئے سورۃ البقرۃ کا نام اس سورت میں وارد گائے کے ایک عجیب پُرحکمت قصے کی بنا پر رکھا گیا۔ سورۃ الاعراف کا نام ''اعراف'' کی رعایت سے رکھا گیا کہ اعراف کا ذکر صرف اسی سورت میں آیا ہے۔ سورۃ النساء میں عورتوں کے بارے میں خصوصی احکامات آئے ہیں' اس لیے اسے سورۃ النساء کا نام دیا گیا۔ سورۃ الانعام کا نام اَنعام (مویشی) پر رکھا گیا۔ اگرچہ دوسری سورتوں میں بھی مویشیوں کا ذکر ہے' لیکن اس سورت میں ﴿وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا﴾ سے لے کر ﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ﴾ تک (آیات ۱۴۲ تا ۱۴۴ میں) جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ کسی دوسری سورت میں بیان نہیں ہوئیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے النساء کا لفظ دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے لیکن جس طرح اس سورت میں عورتوں کے بارے میں احکامات بیان ہوئے ہیں دوسری سورتوں میں بیان نہیں ہوئے۔ سورۃ المائدۃ کا نام مائدہ (دستر خوان) پر رکھا گیا کہ یہ وہ واحد سورت ہے جس میں مائدہ کا ذکر ہے۔ یہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ سورۃ ہود کا نام نبی حضرت ہود علیہ السلام پر رکھا گیا حالانکہ اس سورت میں ہود کے علاوہ نوح' صالح' ابراہیم' لوط' شعیب اور موسیٰ علیہم السلام کے قصے بھی بیان ہوئے ہیں بلکہ نوح علیہ السلام کا قصہ تو بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے؟ میں جواباً کہوں گا کہ جی ہاں! ان انبیاء کے قصے سورۃ الاعراف اور سورۃ الشعراء میں بھی بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں لیکن ان تینوں سورتوں میں ہود وہ واحد سورت ہے جس میں ہود علیہ السلام کا نام چار دفعہ آیا ہے' اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے' کسی بات کی تکرار ان بنیادی اسباب میں سے ہے جن کی بنا پر کسی سورت کا نام رکھا جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس سورت میں نوح علیہ السلام کا ذکر چھ دفعہ آیا ہے یعنی ہود سے بھی زیادہ تو اسے حضرت نوح علیہ السلام کا نام کیوں نہیں دیا گیا؟ جواباً ارشاد ہے کہ چونکہ ایک دوسری سورت میں صرف نوح علیہ السلام کا قصہ ہی بیان ہوا ہے تو اسے سورۃ نوح کا نام دیا گیا جبکہ سورۃ ہود میں بشمول نوح کے کئی انبیاء کا ذکر ہے' برخلاف لفظ ہود کے کہ اس نام سے پوری کوئی سورت نہیں اور نہ ہی کسی دوسری سورت میں لفظ ہود دو مرتبہ سے زائد آیا ہے' اس لیے اس سورت کے لیے ہود کا نام سب سے زیادہ موزوں تھا اور اسی طرح یہ ایک قاعدہ سا بن گیا کہ کسی حرف یا لفظ کی تکرار اسے اس سورت کا نام قرار دیے جانے کے لیے مناسب ہے۔

میں اب اللہ تعالیٰ سے سلامتی اور حفاظت کی دعا کے ساتھ کہتا ہوں کہ حروف مقطعات وہ حروف ہیں جو اس سورت کے کلمات میں سب سے زیادہ تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ آپ ایسی کوئی سورت کے حروف اور الفاظ کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ جن حروف مقطعات سے سورت کی ابتدا ہوئی ہے' اس سورت کے کلمات میں یہ حروف کثرت سے آئے ہیں اور اس کا مقابلہ اس کے برابر کسی دوسری سورت سے کر لیں تو ثابت ہو جائے گا کہ ان حروف کی تعداد پہلی سورت میں کہ جس کی ابتدا حروفِ مقطعات سے ہو رہی ہے' دوسری سے زائد ہے۔

اس قاعدے کو آپ حروفِ مقطعات والی تمام سورتوں پر منطبق کریں تو اسے ٹھیک پائیں گے' اور اسی لیے ''ق'' کو ''ن'' کی جگہ یا برعکس نہیں رکھا جا سکتا کہ ہر حرف اپنے مقام پر ہی موزوں نظر آتا ہے۔ اس وضاحت کی

روشنی میں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جہاں کھیعص آیا ہے وہاں حم عسق کو نہیں رکھا جا سکتا‘ نہ ہی حم کو طس کی جگہ پر‘ نہ ہی المر کو الم کی جگہ پر‘ نہ ہی المر کو المص کی جگہ پر رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی برعکس صحیح ہو سکتا ہے۔ وہ اس لیے کہ ہر سورت کے افتتاح میں وہی حروف موزوں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں وارد ہوئے ہیں اور اللہ بہتر جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے۔

(۵) آیت ۲ : ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ متقی لوگوں کے لیے ہدایت کا سبب ہے‘ اور سورۂ آل عمران کی ابتدا میں تورات اور انجیل کے ضمن میں یوں کہا:

﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾

’’اور اس سے قبل تورات اور انجیل کو اتارا لوگوں کی ہدایت کے لیے۔‘‘

یہاں سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ دونوں جگہوں پر یہ اختلاف کیوں واقع ہوا ہے اور جہاں متقین کا لفظ ہے کیا وہاں الناس آ سکتا ہے اور بالعکس؟ جواباً عرض ہے کہ جیسا وارد ہوا ہے وہی مناسب ہے اور اس کا عکس مناسب نہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت میں باتفاق مفسرین ’’الکتاب‘‘ سے مراد قرآن مجید ہے۔ تورات موسیٰ علیہ السلام اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی‘ اور چونکہ اُمت محمد ﷺ کی خاص فضیلت ہے اس لیے ان کے حال کو بیان کرنے کے لیے متقین کا لفظ لایا گیا اور باقی دونوں کتابوں کے ماننے والوں کا حال بیان کرنے کے لیے الناس کی تعبیر اختیار کی گئی کہ اس طرح اُمت محمدؐ کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے‘ اور یوں دونوں جگہوں پر وہی لفظ اختیار کیا گیا جو وہاں مناسب تھا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ تقویٰ کی صفت تب جچتی ہے جب وہ اس کتاب سے ہدایت حاصل کریں‘ اس کی تصدیق کریں اور اس پر عمل پیرا ہوں‘ تو میں جواباً کہوں گا کہ یہاں غایت کا اعتبار کیا گیا ہے‘ یعنی آخر میں جو کچھ ہونا ہے اس کا خیال رکھا جائے یعنی مآل کا اعتبار۔ یہ ایک وسیع باب ہے اور اس کی ایک مثال اس آیت میں ہے:

﴿اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ﴾ (یوسف:۳۶)

’’میں اپنے آپ کو شراب نچوڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔‘‘

(اصل میں تو انگور نچوڑ نا تھا‘ شراب تو اس عمل کے نتیجے میں پیدا ہوگی۔) یوں یہ بات ثابت ہوگئی کہ مذکورہ دونوں الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ پر رکھنا غیر مناسب ہوگا‘ اور اللہ بہتر جانتے ہیں کہ ان کی کیا مراد ہے۔

(۶) آیت ۹:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝﴾

’’وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں‘ حالانکہ وہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنے آپ کو اور انہیں اس کا احساس تک نہیں ہے۔‘‘

اور پھر فرمایا:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝﴾

اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ۝۱۳ ﴾

پہلی دونوں آیات میں شعور کی اور آخری آیت میں علم کی نفی کی گئی تو اس کا کیا سبب ہے؟

جواب یہ ہے کہ شعور' احساس پر دلالت کرتا ہے۔ یہ لفظ شعار سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے وہ کپڑا جو جسم سے مس کرتا ہو تو جسم اسے بغیر کسی فکر اور تدبر کے محسوس کرتا ہے۔ اس احساس میں انسان اور حیوان میں فرق نہیں ہے' لیکن علم فکر و تدبر کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ البتہ بعض اربابِ نظر کے مطابق اس کے مقدمات محسوس بھی ہو سکتے ہیں اور غیر محسوس بھی۔ گویا علم کا تعلق اربابِ عقل و فکر سے ہے اور ایمان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ وہ فکر و نظر یا علم کا محتاج ہے۔ اور یہ فکر و نظر ایک عاقل شخص ہی کا وصف ہو سکتے ہیں جو یہ جانتا ہو کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ منافقون نے مومنوں کو سُفہاء (بے وقوف) کہہ کر ان سے ایمان کی نفی کر دی۔ سفہاء سے ان کی مراد تھی وہ لوگ جو بردباری کے وصف سے عاری ہوں اور معاملات کو جانچنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ ان کا قول یہ تھا: ﴿ اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ﴾ ''کیا ہم ایسے ایمان لے آئیں جیسے بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟'' تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید میں کہا: ﴿ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ۝۱۳ ﴾ ''خبردار' بیوقوف تو وہ خود ہیں......'' اور اس طرح ان کے صاحبِ علم ہونے کی نفی کر دی' یعنی جس چیز کی انہوں نے مؤمنوں کے لحاظ سے نفی کی تھی' اللہ نے ان سے اسی کی نفی کر دی اور جو لقب انہوں نے غیروں کو عطا کیا تھا' اللہ نے وہی لقب انہیں عطا کر دیا۔

اب ملاحظہ کیجیے کہ زمین میں فساد برپا کرنا اور اسے دھوکہ دینا کہ جسے دھوکہ نہ دیا جا سکتا ہو' ایک ایسی بات ہے جو کسی پر مخفی نہیں۔ اس لیے مفسدین کی نسبت سے شعور اور احساس کی نفی کی' یہاں علم کا ذکر غیر مناسب تھا۔ اس لیے دونوں آیات اپنی اپنی جگہ پر موزوں ہیں۔

اس نکتے کی بابت ابوالفضل بن خطیب ☆ کہتے ہیں:

اوّلاً: یہ کہنا کہ مؤمن حق پر ہیں اور منافقین باطل پر' ایک عقلی اور فکری امر ہے' لیکن نفاق جو کہ سرکشی پر مشتمل ہو اور زمین میں فساد برپا کرنے پر تلا ہوا ہو' ایک امرِ حسی ہے جس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔

ثانیاً: سَفَہ یعنی جَھْل کے مقابلے میں علم کا لایا جانا لفظی مطابقت کے لحاظ سے بھی موزوں ہے۔

لیکن جو بات میں نے بیان کی ہے وہ ان آیات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

(۷) آیت ۱۸:

﴿ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۝۱۷ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۝۱۸ ﴾

''اور ان کو تاریکیوں میں ایسا چھوڑا کہ وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ بہرے گونگے اندھے ہیں' اور وہ پھر واپس نہ آ سکے۔''

اور پھر آیت ۱۷ میں ارشاد فرمایا:

☆ شاید اس سے مراد لسان الدین بن الخطیب' ابوعبداللہ' محمد بن عبداللہ بن سعید السلمانی (۷۱۳۔۷۷۶ھ) ہیں۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''کافروں کی مثال ان (جانوروں) کی طرح ہے جو (اپنے چرواہے کی) صرف پکار اور آواز ہی کو سنتے ہیں (سمجھتے نہیں)' بہرے گونگے اندھے ہیں اور وہ عقل نہیں رکھتے۔''

پہلی آیت کا اختتام ''لَا يَرْجِعُوْنَ'' پر اور دوسری کا ''لَا يَعْقِلُوْنَ'' پر ہوا' تو اس اختلاف کا کیا سبب ہے حالانکہ ان کے جو اوصاف بطور سبب اور علت وارد ہوئے ہیں وہ تو ایک جیسے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں منافقوں کے حال کی تمثیل بیان ہوئی ہے' جیسے کہ ایک شخص اندھیری رات میں روشنی کی خاطر آگ جلائے' لیکن جونہی آگ بھڑکی' اللہ نے اُسے بجھا دیا' دوبارہ تاریکی چھا گئی اور اب اس شخص کے پاس وہ روشنی نہ رہی کہ جس کی طرف وہ لوٹتا اور اپنی پریشانی کو دور کرتا۔

دوسری آیت میں کافروں کی تمثیل بیان کی گئی ہے کہ وہ ان بکریوں کی مانند ہیں کہ چرواہا ان پر چیختا چلاتا ہے اور یہ بکریاں صرف ایک آواز سنتی ہیں لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ چرواہا ان سے کیا کہہ رہا ہے۔ ایسے ہی کافروں کی حالت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ نہیں سمجھ پا رہے کہ وہ کیا خطاب کر رہے ہیں اور کیا چاہتے ہیں' اسی لیے ان کے بارے میں ''لَا يَعْقِلُوْنَ'' کہا۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک کافروں کا بکریوں سے تشبیہ کا تعلق ہے تو اس کا ذکر صراحتاً سورۃ الفرقان کی اس آیت میں آ گیا ہے:

﴿اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ﴾ (آیت ۴۴)

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کی اکثریت سنتی ہے یا سمجھتی ہے؟ وہ تو جانوروں کی طرح ہیں۔''

تو ان کا جانوروں کی طرح ہونا ظاہر ہو گیا' لیکن سورۃ البقرۃ کی آیت میں تو کفار کو اُس چرواہے سے تشبیہ دی گئی ہے جو بکریوں کو ہنکار رہا ہے نہ کہ خود بکریوں سے' تو پھر آیت کو کیسے سمجھا جائے گا؟

جواب یہ ہے کہ کلام میں ایجاز کے لیے بعض دفعہ اس چیز کو حذف کر دیا جاتا ہے جو سیاق و سباق سے سمجھ میں آ رہی ہو۔ اس آیت میں بھی دو چیزوں کی طرف بطور تشبیہ اشارہ کیا گیا ہے لیکن ایک چیز کو حذف کر دیا گیا ہے۔ ہم اپنی بات کی وضاحت اس شعر سے کرتے ہیں:

وانّی لَیَعْرُونی لذِکْرِكِ فَتْرَةٌ ۔۔۔ کَمَا انْتَفَضَ الْعُصْفُورُ بَلَّلَهُ الْقَطْرُ

''مجھے تمہاری یاد آنے پر ایسی لرزش طاری ہوتی ہے جیسے کہ وہ چڑیا جس پر بارش کے قطرے گرے تو وہ لرز اٹھی۔''

ظاہر میں تو ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے اپنے جسم کی لرزش کو چڑیا کی لرزش سے تشبیہ دی ہے' لیکن اس کی مراد یہ نہیں ہے' بلکہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی یاد آنے پر اسے جو کپکپاہٹ ہوتی ہے وہ اس کپکپاہٹ سے ملتی جلتی ہے جو چڑیا پر بارش کے قطرے گرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ گویا یہاں دو چیزیں ہیں:

شاعر پر وہی کیفیت کا طاری ہونا جو چڑیا پر طاری ہوتی ہے (یعنی محبوب کی یاد بمقابل چڑیا پر بارش کے قطرے کا گرنا) اور پھر شاعر پر لرزش کا طاری ہونا جو چڑیا پر بھی طاری ہوتی ہے۔

سیبویہ نے بھی اسی مفہوم کے مطابق کہا: کفار کو چرواہے سے تشبیہہ نہیں دی جا رہی بلکہ ان جانوروں سے تشبیہہ دی جا رہی ہے جن کے اوپر چلّایا جا رہا ہے۔

گویا بات یوں ہوئی کہ تمہاری اور کافروں کی مثال ایسے ہے جیسے چرواہے کی اور ان جانوروں کی جن پر چلّایا جا رہا ہے‘ لیکن ایجاز واختصار کی خاطر یہاں اس چیز کو حذف کر دیا گیا جو مخاطب کے علم میں بآسانی آ سکتی ہے۔

اب آپ یہاں یہ سوال کریں گے کہ اس آیت کا اعراب کیسے ہوگا؟

تو جواباً کہوں گا کہ قریب ترین حل یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں مضاف کو محذوف مانا جائے‘ یعنی **وَمَثَلُ دَاعِی الَّذِین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یَسْمَعُ** ’’اُس شخص کی مثال جو کفار کو دعوت دے رہا ہے اس شخص جیسی ہے جو ایسی آواز لگاتا ہے جو سنائی نہیں دیتی‘‘۔ اکثر لوگوں کے نزدیک یہی تقدیر اعراب مناسب معلوم ہوتی ہے‘ اور آپ چاہیں تو ہماری وضاحت کو قبول فرمائیں‘ جس میں معنی اور اعراب دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے‘ اور جسے ہمارے اکثر شیوخ اور متقدمین نے اختیار کیا ہے۔

(۸) آیت ۲۳:

﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۞﴾

’’اور اگر تم واقعتاً شک میں ہو اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اتارا اپنے بندے پر (کہ یہ ہمارا نازل کردہ ہے یا نہیں) تو لے آؤ ایک ہی سورت اِس جیسی۔ اور بلا لو اپنے سارے مددگاروں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔‘‘

اور سورۂ یونس‘ آیت ۳۸ میں ارشاد فرمایا:

﴿اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۞ بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ ۞﴾

’’کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو پیغمبرؐ نے خود گھڑ لیا ہے؟ آپؐ (ان سے) کہیے کہ لے آؤ تم بھی ایک سورت اس جیسی اور (اس کے لیے) بلا لو جس کو بلا سکتے ہو اللہ کے سوا‘ اگر تم سچے ہو۔ (نہیں) بلکہ انہوں نے تکذیب کی ہے اس چیز کی جس کے علم کا یہ احاطہ نہیں کر سکے اور ابھی نہیں آئی ان کے پاس اس کی تاویل۔ اسی طرح جھٹلایا تھا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے تھے‘ تو دیکھو کیسا انجام ہوا ظالموں کا!‘‘

اور سورۂ ہود‘ آیت ۱۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۞﴾

’’کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) اُس نے خود گھڑ لیا ہے۔ آپ کہیے کہ اچھا تم لوگ بھی لے آؤ اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی اور (اس کے لیے) بلا لو تم جس کو بھی بلا سکتے ہو اللہ کے سوا‘ اگر تم سچے ہو۔‘‘

یہاں چار سوال اٹھتے ہیں:

(۱) سورۃ البقرۃ میں ’’مِنْ مِّثْلِهٖ‘‘ کہا اور باقی دونوں آیات میں صرف ’’مِثْلِهٖ‘‘

(۲) پہلی دونوں آیات میں ایک سورت لانے کا چیلنج ہے‘ لیکن سورۂ ہود میں دس سورتوں کا۔

(۳) سورۂ ہود کی آیت میں دس سورتوں کے ساتھ ’’مُفْتَرَيٰتٍ‘‘ کا اضافہ ہے۔

(۴) سورۃ البقرۃ کی آیت میں ’’وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ‘‘ کہا گیا اور باقی دونوں آیات میں ’’وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ‘‘ تو اس کی کیا وجہ ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر منکرین کو وہ چیز دکھانا مقصود ہے جس سے ان کا شک دور ہو سکے‘ گویا یوں کہا جا رہا ہے:

اگر تم لوگ نبی ﷺ کی نبوت میں شک کرتے ہو کہ ہم نے صرف اسے ہی کیوں چنا ہے‘ تو پھر کوئی دوسرا ایسا آدمی لے کر آؤ جو ایسی ایک سورت ہی بنا کر دکھا دے جیسی کہ تم محمد ﷺ سے سنتے ہو‘ اور ایسے گواہ لے کر آؤ کہ اہلِ عرب میں کوئی دوسرا شخص ایسا بھی ہے جس سے ایسا ہی کلام صادر ہوتا ہو یا وہ ایک ایسی سورت لانے پر قادر ہو جیسی محمد ﷺ سے سنی گئی ہے‘ اور اگر تم ایسا کرنے سے عاجز رہو‘ حالانکہ خِلقت اور کلام کو پہچاننے کے لحاظ سے تم لوگوں میں مماثلت پائی جاتی ہے چونکہ زبان وہی زبان ہے جو تمہاری جانی پہچانی ہے اور پھر بھی تم عاجز رہو—اور تمہیں عاجز رہنا پڑے گا—تو پھر اس آگ سے بچنے کا سامان کر لو جس سے وہ تمہیں تمہاری کذب بیانی کی بنا پر ڈرا رہا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہاں ’’مِنْ‘‘ کا آنا ضروری تھا جو تبعیض (یعنی ’’بعض‘‘ پر دلالت کرنے والا) کے لیے لایا جاتا ہے۔ اور سورۂ یونس میں جب شروع ہی میں کہہ دیا: ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ط﴾ ’’کیا وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو اُس نے خود وضع کیا ہے؟‘‘ تو گویا ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر یہ قرآن بقول تمہارے بناوٹی ہے تو پھر اس جیسا کلام لانے میں تمہیں کیا رکاوٹ ہے؟ تو پھر لاؤ ایسی ایک سورت جو قرآن جیسی ہو! تو یہاں قرآن کے مماثل کلام لانے کی نفی ہو رہی ہے تاکہ ان کے عاجز ہو جانے کی صورت میں ان پر حجت قائم ہو جائے۔ جبکہ سورۃ البقرۃ میں ایسے شخص کی نفی کی جا رہی ہے کہ جس سے ایسا کلام سنا جو نبی ﷺ کے لائے ہوئے کلام کا فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مماثل ہو۔ یوں دونوں سورتوں کے مقصد میں اختلاف ہے‘ لیکن **تعجیز** (عاجز کر دینے) کے اعتبار سے دونوں میں اتحاد ہے۔ اور اس اختلافِ مقصد کی بنا پر سورۃ البقرۃ کی آیت میں ’’مِنْ‘‘ کا اضافہ ضروری تھا تاکہ معنی مقصود حاصل ہو سکے اور سورۂ یونس کی آیت میں چونکہ بغیر ’’مِنْ‘‘ کے معنی واضح تھا اس لیے ’’مِنْ‘‘ لانے کی ضرورت نہ تھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ اگر سورۂ یونس میں بھی ’’مِنْ‘‘ ہوتا تو یہی مطلب حاصل ہوتا تو پھر ’’مِنْ مِّثْلِهٖ‘‘ کیوں نہ کہا گیا؟

میں عرض کروں گا کہ اگر یہ مطلب ''مِنْ'' کے لانے یا نہ لانے دونوں صورتوں میں ادا ہو سکتا ہے تو پھر ایجاز کا تقاضا ہے کہ اسے نہ لایا جائے' لیکن سورۃ البقرۃ میں ''مِنْ'' کے لائے بغیر مطلب واضح نہیں ہوتا تھا اس لیے وہاں ''مِنْ مِّثْلِهٖ'' کہا گیا۔ یعنی ہر صورت میں صورتِ حال کے مطابق بات کہی گئی۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب سورۂ ہود میں دس بناوٹی سورتوں (بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ) کے لانے کا چیلنج دیا گیا تو بناوٹی کہہ کر چیلنج کو وسیع کر دیا کیونکہ بناوٹی بات بنانا زیادہ آسان ہوتی ہے' اور اس وسعت کی بنا پر عدد میں بھی وسعت کو اختیار کیا گیا۔ باقی دونوں سورتوں میں بناوٹی سورت لانے کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ سورت کے مماثل سورت لانے کا چیلنج دیا گیا تھا اور یہ چیز ان عربوں کے لیے زیادہ مشکل تھی۔ بہرصورت وہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے' لیکن اس کی نوعیت تنگی اور وسعت کے اعتبار سے تھی' جہاں تنگی تھی وہاں ایک سورت لانے کا مطالبہ کیا گیا اور جہاں وسعت تھی وہاں دس سورتیں لانے کا مطالبہ کیا گیا۔ بعض مفسرین نے یہی بات لکھی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ دس سورتوں کے ساتھ بناوٹی ہونے کا وصف اس لیے لایا گیا تا کہ ان کا عاجز ہونا ہر طرح سے ثابت ہو سکے۔ یعنی پہلے تو یہ چیلنج دیا گیا کہ کیا ان کے پاس ایسا کوئی شخص ہے جس کے پاس ایسا ہی کلام ہو جیسے محمد ﷺ سے سنا گیا ہے؟ یعنی کوئی ایک سورت بھی ایسی وہ لا سکتے ہیں جیسے رسول اللہ ﷺ نے پڑھ کر سنائی ہے؟ اور پھر دوسرا چیلنج یہ دیا کہ تمہیں اور چھوٹ دیتے ہیں' کوئی بناوٹی کلام ہی لا کر دکھا دو! اور ان کے عاجز ہونے کی صورت میں واضح ہو گیا کہ وہ صرف عناد کی بنا پر قرآن کی حقانیت کو قبول نہیں کر رہے۔

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں ''وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ'' کہا گیا' یعنی ایسا کوئی گواہ لے کر آؤ جو اس بات کی گواہی دے کہ اہل عرب میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس سے ویسا ہی کلام سنا گیا ہو جیسے محمد ﷺ سے سنا گیا۔ صرف دعویٰ کرنا کافی نہ ہوگا بلکہ ایسا کوئی گواہ پیش کرنا ضروری ہوگا۔

سورۂ یونس میں یوں کہا گیا کہ قرآن کی سورتوں جیسی ایک سورت لا کر دکھاؤ اور اس کام پر جو تمہاری مدد کر سکے اس کی مدد حاصل کرو۔ یہاں گواہ کا مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ صرف اتنا کہا گیا کہ ایسے کلام کی تالیف و ترتیب کے لیے اگر تم مدد کے طلب گار ہو تو مدد لے سکتے ہو۔ کیونکہ اگر وہ خود قرآن کی سورت جیسی سورت تالیف کر سکتے تو پھر اس کے ساتھ گواہ لانے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ ہاں اگر وہ یہ کہتے کہ اہل عرب میں اس قسم کا کلام سنا گیا ہے تو پھر ان کا محض دعویٰ کافی نہ تھا بلکہ اس پر گواہ لانا ضروری تھا۔

سورۃ الانفال میں ان کا اس طرح کا دعویٰ نقل کیا گیا ہے:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۱﴾

''اور جب ان پر ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم نے سن لیا' ہم چاہیں تو ایسی ہی بات ہم بھی کہہ سکتے ہیں' یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

اس اعتبار سے آیت سورۂ ہود اور سورۂ یونس ایک جیسی ہیں۔

(۹) آیت ۳۵:

﴿وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (آیت ۳۵)

''اور ہم نے کہا اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں اور کھاؤ اس میں سے بافراغت جہاں سے چاہو۔مگر اس درخت کے قریب مت جانا۔''

اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾

''اور (پھر ہم نے آدم سے کہا کہ) اے آدمؑ رہو جنت میں تم اور تمہاری بیوی' اور کھاؤ پیو اس میں سے جہاں سے تم دونوں چاہو' اور (ہاں) اس درخت کے قریب مت جانا۔''

یہاں دو سوال اٹھتے ہیں:

(۱) سورۃ البقرۃ میں جہاں کھانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اس سے قبل ''واو النسق'' ہے' جس کا مطلب ہے کہ یہاں مختلف چیزوں میں ترتیب کا ہونا ضروری نہیں ہے' اِلا یہ کہ ترتیب کسی دوسرے وجہ سے سمجھی جائے۔لیکن سورۃ الاعراف میں حرف فاء لایا گیا جس سے ترتیب لازمی سمجھی جاتی ہے' یعنی یہ بات پہلی بات کے بعد میں ہونے والی ہے —— سوال یہ ہے کہ جب قصہ ایک ہی ہے تو یہ اختلاف کیوں؟

(۲) سورۃ البقرۃ میں کھانے کے بعد (رَغَدًا) کہا گیا لیکن سورۃ الاعراف میں یہ لفظ نہیں کہا گیا حالانکہ قصہ ایک ہی ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں ہم عرض کریں گے (اور اللہ بہتر جانتے ہیں) کہ دونوں آیتوں کا سیاق وسباق مختلف ہے۔سورۃ البقرۃ میں صرف یہ مقصود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو وہ واقعات بتائے جائیں جن کا تعلق قصہ آدم سے ہے' جیسے ان کی ابتداءِ پیدائش کیسے ہوئی؟ فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ انہیں سجدہ کریں' ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا' پھر آدم کو جنت میں رہنے اور کھانے کا حکم دیا گیا۔ان تمام باتوں کا بغیر کسی زمانی ترتیب کے بیان مقصود تھا' اس لیے یہاں بجائے حرف فاء کے حرف واؤ لایا گیا۔لیکن سورۃ الاعراف کی آیت میں آدم علیہ السلام اور ان کی نسل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان مقصود ہے۔دیکھئے قصہ آدم سے پہلے ذکر کیا گیا:

﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰﴾

''اور ہم نے تمہیں زمین میں تمکین عطا کی اور وہاں تمہارے لیے معیشت بنائی۔تم شکر کرتے ہو لیکن بہت تھوڑا۔''

اس کے بعد انسان کی تخلیق اور تصویر کا ذکر ہے' پھر فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا ذکر ہے' آدم کو سجدہ نہ کرنے پر اس کی حجت بازی کا ذکر ہے اور پھر صرف ابلیس کو دھتکارنے کا تذکرہ ہے:

﴿قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ﴾ (آیت ۱۸)

''کہا کہ یہاں سے نکل جا حقیر اور دھتکارا ہوا۔''

اور پھر شیطان کے آدمؑ کو بہلانے‘ پھسلانے‘ آدمؑ کے ممنوعہ درخت کا پھل کھانے‘ آدمؑ کا اپنی خطا کا اعتراف کرنے اور بالآخر اللہ کا آدمؑ کو زمین پر اتر جانے کا حکم ہے‘ اور پھر آدمؑ کو شیطان کے پھندوں سے بچنے کے لیے ان الفاظ سے تنبیہہ کی گئی:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ﴾ (آیت ۲۷)

’’اے بنی آدم! کہیں شیطان تمہیں ایسے نہ بہکا دے جیسے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا تھا۔‘‘

یعنی یہاں ترتیب مقصود تھی اس لیے حرف ’’فاء‘‘ کو لایا گیا جس سے ترتیب لازم ہے‘ حرف ’’واؤ‘‘ نہیں لایا گیا جو صرف مختلف باتوں کو اکٹھا بیان کرنے کے لیے لایا جاتا ہے۔ یہاں ایک کے بعد دوسری نعمت کا بیان مقصود تھا جبکہ سورۃ البقرۃ میں صرف واقعات کا بتانا مقصود تھا اور اسی اعتبار سے دونوں آیتوں میں یہ اختلاف واقع ہوا‘ واللہ اعلم!

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ سورۃ البقرۃ میں لفظ ’’رَغَدًا‘‘ کا ذکر ہوا اور سورۃ الاعراف میں اسے حذف کر دیا گیا تو وہ اس وجہ سے کہ یہاں پہلے ’’مِنْ‘‘ کا ذکر ہے (مِنْهَا یعنی جنت میں سے) اب چونکہ ’’مِنْ‘‘ تبعیض کے لیے استعمال ہوتا ہے‘ (یعنی کچھ کے معنی میں) تو یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ کچھ کچھ کھانے کا حکم دیا گیا ہے یعنی کم کھاؤ‘ بہت کچھ نہ کھاؤ‘ حالانکہ ایسا مطلوب نہ تھا۔ تبعیض سے مراد ہے کہ جنت میں اتنا کچھ ہے کہ جتنا بھی کھاؤ گے وہ جنت کی وسعت کے اعتبار سے ’’کچھ‘‘ ہوگا۔ جنت تو جگہ ہی ایسی ہے کہ اگر ساری اولادِ آدم بھی وہاں کھانے میں مصروف ہو تو اس کا ’’کچھ‘‘ حصہ ہی کھا سکے گی‘ وہاں تو ہر نعمت فراواں ہے‘ وہ کچھ ہے جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل میں اس کا خیال تک نہیں آ سکا۔ اب چونکہ ’’مِنْ‘‘ کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا اس لیے (رَغَدًا) کا لفظ لا کر بتا دیا کہ جی بھر کر کھاؤ۔

رہی سورۃ الاعراف تو اس میں چونکہ اس قسم کا شبہ واقع نہیں ہو رہا تھا اس لیے ’’رَغَدًا‘‘ کا لفظ لانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہاں پر کہا گیا ’’مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا‘‘ کھاؤ جہاں سے بھی چاہو۔ گویا کھلی چھٹی دے دی گئی کہ جہاں سے چاہو‘ کھاؤ۔ اب جنت وسیع بھی ہے اور طرح طرح کے میوے وہاں پر موجود ہیں‘ اور دعوتِ عام ہے کہ جہاں سے چاہو کھاؤ تو پھر ’’رَغَدًا‘‘ کا لفظ لانے کی ضرورت نہ رہی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سورۃ البقرۃ میں بھی تو ’’حَيْثُ شِئْتُمَا‘‘ کے الفاظ موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ سے کھانے کی اجازت ہے تو پھر ’’رَغَدًا‘‘ کا لفظ کیوں لایا گیا؟

اس کے جواب میں ہم توجہ دلائیں گے کہ دونوں عبارتوں میں فرق ہے:

’’حَيْثُ شِئْتُمَا‘‘ جہاں کہیں سے چاہو۔

اور ’’مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا‘‘ ہر اُس ثمر سے جو کہیں بھی ہو۔

پہلی آیت (مِنْ کے بغیر) سے اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ہر جگہ سے کھانے کی اجازت ہے‘ خاص طور پر ہر ثمر سے کھانے کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ جیسے ایک شخص سے کہا جائے:

كُلْ هٰذَا الْعُنقودَ حيثُ شِئتَ مِن هٰذَا الْبُستان

’’یہ انگور کھاؤ جہاں چاہو اس باغ میں سے‘‘

اور اگر یوں کہا:

کُلْ مِنْ حیثُ شِئْتَ مِنْ مَواضِعِ هٰذا البُستان

''اس باغ کی جس جگہ سے بھی چاہو' کھاؤ۔''

تو اسے باغ کی ہر جگہ سے کھانے کی اجازت حاصل ہوگئی۔ گویا دوسری ترکیب میں کھانے کی' بہ نسبت پہلی ترکیب کے' زیادہ وسعت ہے۔

اس مثال سے مقصود واضح ہوگیا کہ سورۃ البقرۃ میں ''رَغَدًا'' کیوں لایا گیا' اور سورۃ الاعراف میں اس کے بغیر کیوں اکتفا کیا گیا۔

(۱۰) آیت ۳۸:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى......﴾

''ہم نے کہا کہ تم سب وہاں سے اتر آؤ' اور پھر جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے......''

لیکن سورۃ الاعراف کی آیت ۲۴ میں اس لفظ (اِهْبِطُوْا) کے ساتھ یہ اضافہ ہے: ﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ ''تم میں سے کچھ دوسروں کے لیے آپس میں دشمن ہیں۔''

اور ایسے ہی سورۃ طٰہٰ کی آیت ۱۲۳ میں بھی یہ اضافہ موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت میں اس اضافے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے پچھلی آیت (نمبر ۳۶) میں چونکہ یہ اضافہ موجود ہے: ﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ﴾ اس لیے تکرار سے بچنے کے لیے دوبارہ اس کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ سورۃ الاعراف اور سورۃ طٰہٰ میں یہ آیت ایک ہی دفعہ آئی ہے اس لیے ان الفاظ کا لانا مناسب سمجھا گیا۔

(۱۱) آیت ۳۸:

﴿فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ﴾

''اور پھر جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔''

لیکن سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۳ میں فرمایا: ﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ﴾

یہاں لفظ ایک ہی ہے لیکن صیغے کا اختلاف ہے۔ یعنی تَبِعَ اور اتَّبَعَ۔

اس اختلاف کی وجہ کیا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ دونوں الفاظ کا مطلب ایک ہے' لیکن صیغے کے اختلاف کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ''تَبِعَ'' اصل ہے اور ''اتَّبَعَ'' فرع ہے۔ تَبِعَ میں ''پیروی کرنا'' لیکن بغیر کسی غور و فکر یا ذہنی مشقت کے' اور ''اتَّبَعَ'' میں پیروی کرنا لیکن غور و فکر اور ذہنی مشقت کے ساتھ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ فطری ترتیب یہی ہو سکتی تھی کہ پہلے ''تَبِعَ'' لایا جائے جو کہ اصل ہے اور اس کے بعد ''اتَّبَعَ'' جو کہ فرع ہے۔

ایک دوسرا جواب بھی ہو سکتا ہے جو کہ اصل میں پہلے جواب کی مزید توضیح ہے اور وہ یہ کہ جیسے پہلے کہا گیا: ''اتَّبَعَ'' کے مفہوم میں غور و خوض کرنا اور ذہنی مشقت شامل ہے' اور یہ مفہوم ''تَبِعَ'' میں نہیں پایا جاتا جو کہ اصل

ہے۔ ''تَبِعَ'' سے مراد ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی بغیر کسی سوچ بچار کے پیروی کرتا چلا جائے۔ یہ دونوں الفاظ جہاں بھی استعمال ہوں گے' سیاق وسباق سے اسی مفہوم کی تائید ہوگی جو ہم نے بیان کیا ہے۔

مثال کے طور پر ابراہیم الخلیل علیہ السلام کا قول ملاحظہ فرمائیں جیسے کہ قرآن میں ارشاد ہوا:

﴿فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ج﴾ (ابراھیم:٣٦)

''جو میری پیروی کرتا ہے وہ مجھ سے ہے۔''

یہاں وہ اپنے پیروکار سے (فَاِنَّهٗ مِنِّیْ) کہہ کر انتہائی قرب کا اظہار کر رہے ہیں' یعنی وہ ایسا شخص ہے جو کھلے شواہد کی بنا پر فطری طور پر ہدایت یافتہ ہے' اسے ہدایت کے حصول میں کوئی زیادہ ذہنی مشقت پیش نہیں آئی۔ اس لیے اس کے لیے لفظ ''تَبِعَ'' ہی مناسب ہے۔ اس کے مقابلے میں گمراہ لوگوں کا حال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ط﴾ (القصص: ٥٠)

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی طرف سے ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی پیروی کی!''

یہاں ایسے لوگ مراد ہیں جو فطرت کی آواز سے بھاگ رہے ہیں اور ان چیزوں کی طرف لپک رہے ہیں جن کی نہ کوئی دلیل ہے نہ برہان۔ یعنی فطرت سے اعراض کرنے کے لیے انہیں اچھی خاصی مشقت کرنا پڑی ہے اور اس لیے لفظ ''اتَّبَعَ'' ان کے لیے مناسب ہے۔ اور پھر ایسے ہی لوگوں کے لیے' بیع وشراء کی تصویر کشی کی گئی۔ فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ص فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾ (البقرۃ:١٦)

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کا سودا کیا ہے تو پھر ان کی تجارت سودمند ثابت نہیں ہوئی۔''

یہ ایسے لوگوں کی تصویر کشی ہے جن کے سامنے دلائل اور شواہد کا انبار لگا ہوا تھا' وہ خود بھی سنتے تھے' دیکھتے تھے' دل کی دولت سے مالا مال تھے لیکن انہوں نے فطرت کے دلائل کو جان بوجھ کر اور خوب غور وخوض کے بعد چھوڑا۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ارشاد فرمایا:

﴿فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ لا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ (الاحقاف:٢٦)

''لیکن ان کے کانوں اور آنکھوں اور دلوں نے انہیں کچھ بھی نفع نہ پہنچایا جبکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرنے لگے۔''

''جَحَد'' یعنی انکار کرنا اُسی وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی ایسی معلوم چیز کا انکار کرے جو اُسے حاصل ہو چکی ہو اور پھر وہ باطل پر ڈٹا رہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے لفظ ''اتّبع'' مناسب ہے نہ کہ ''تَبِعَ''۔

ایسے ہی یہ لفظ ان نافرمانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا جو مخالفت میں حد سے بڑھ گئے ہوں۔ انہیں کہا گیا:

﴿وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الزمر:٥٥)

''اور پیروی کرو اُس بہترین چیز کی جو تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔''

یہ لوگ چونکہ گناہوں کے عادی ہو چکے تھے اور مخالفت ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی' اس لیے اپنی اس حالت سے ہٹنے کے لیے انہیں مشقت اور ریاضت کی ضرورت تھی' اس لیے لفظ ''اتبع'' لایا گیا۔

اب دیکھئے اہل ایمان کو کہا گیا: ﴿لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ (النور: ۲۱) ''شیطان کے قدم بقدم نہ چلو''۔ وہ اس لیے کہ اہل ایمان کے لیے نیکیاں کرنا ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ اور پھر اگر وہ بدی کی راہ پر چلیں گے تو فطرت کے اُلٹ کام کرنے کے لیے انہیں کافی محنت و مشقت برداشت کرنا ہوگی۔ اس لیے یہاں بھی لفظ ''لَا تَتَّبِعُوْا'' لایا گیا۔

اب اس وضاحت کے بعد دوبارہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ طٰہٰ کی آیات ملاحظہ فرمائیں۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کو جنت میں رہنے' جنت کے پھل رغبت سے کھانے وغیرہ کا ذکر کیا گیا اور پھر صرف اتنا کہا گیا کہ شیطان نے انہیں بہکا دیا۔ شیطان کی حجت بازی اور وسوسے کا ذکر نہیں گیا' اس لیے یہاں ''فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ'' کا ذکر ہوا۔ لیکن سورۃ طٰہٰ میں شیطان کے وسوسے کا تفصیلی ذکر ہے:

﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝۱۲۰﴾ (طٰہٰ)

''کیا میں تجھے دائمی زندگی کا درخت اور ایسی بادشاہت بتلاؤں جو کبھی پرانی نہ ہو!''

اور اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سورۃ الاعراف میں بیان کیا گیا:

﴿مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝۲۰﴾

''تمہارے ربّ نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتے نہ بن جاؤ یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔''

پھر اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے اس پر قسم بھی کھائی۔ اب جب سورۂ طٰہٰ میں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا تو شیطان لعین کے حیلوں بہانوں کی قوت کا بھی اندازہ ہو گیا' اور یہ کہ وہ کیسے کیسے بنی آدم کو بہلا اور پھسلا سکتا ہے اور طاغوت کی عبادت کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے اور کیسے عقل کے اندھے اس کے پیچھے لگے چلے آتے ہیں۔ اور اگر ایسی صورتحال ہو تو پھر حق کو پہچاننے میں کتنی دقت اور مغزماری کی ضرورت ہوگی۔ اس اعتبار سے سورۂ طٰہٰ میں ''اتَّبَعَ'' کا لفظ لانا اور سورۃ البقرۃ میں ''تَبِعَ'' کا لفظ لانا مناسب ٹھہرا' اور یہ مناسبت ہر طرح سے ہے' معنی و مطالب کے اعتبار سے بھی۔ اور اختصار و طوالت کے اعتبار سے بھی۔ یعنی جہاں مضمون مختصر تھا وہاں ''تَبِعَ'' ذکر کیا اور جہاں تفصیل تھی وہاں ''اتَّبَعَ'' کا ذکر ہوا۔ یہاں ترتیب کا بھی خیال رکھا گیا ہے' یعنی اصل کو پہلے اور اس کی فرع کو بعد میں لایا گیا۔ ''تَبِعَ'' اصل ہے جسے ابتدائی سورت (البقرۃ) میں ذکر کیا اور ''اتَّبَعَ'' فرع ہے جسے دُور کی سورت (طٰہٰ) میں بیان کیا گیا۔ اور اس طرح تینوں اعتبارات سے مناسبت ظاہر ہو گئی۔ واللہ اعلم!

(۱۲) آیت ۴۵:

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵﴾

''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔ یہ چیز شاق ہے مگر ڈرنے والوں پر۔''

اور آیت ۱۵۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳﴾

''صبر اور نماز سے مدد چاہو' بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

یہاں پر یہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں: (۱) ہر آیت کا آخری حصہ دوسری آیت سے مختلف ہے' اس کی کیا وجہ ہے؟ اور (۲) کیا ایک آیت کا آخری حصہ دوسری آیت میں لگایا جا سکتا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ آیت کا تتمہ اسی آیت کے مناسب ہے جہاں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی آیت کا تتمہ ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵﴾ اس اعتبار سے ہے جس اعتبار سے یہ آیت بنی اسرائیل کے سیاق و سباق میں وارد ہوئی ہے۔ بنی اسرائیل میں نماز کے بارے میں جو سستی' بوجھل پن اور اس پر مستزاد ضعفِ ایمانی اور اخلاص کی کمی کی کیفیت پائی جاتی تھی اس کی مناسبت سے یہ الفاظ لائے گئے۔ دیکھئے منافقین' جن کی اکثریت یہودیوں میں سے تھی' کے بارے میں کہا گیا:

﴿وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى﴾ (التوبة:٥٤)

''اور وہ نماز کو نہیں آتے مگر سست روی کے ساتھ۔''

اور یہ بھی کہا:

﴿وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى﴾ (النساء:١٤٢)

''اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔''

تو پہلی آیت میں بنی اسرائیل کے ذکر کی مناسبت سے ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵﴾ کے الفاظ لائے گئے اور دوسری آیت میں جہاں خطاب ہی اہل ایمان سے ہو رہا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ﴾ اور جہاں استقامت و رضا مندی پائی جاتی ہے وہاں صبر کا ذکر کیا گیا کہ اللہ صابروں کے ساتھ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جنت میں حصولِ درجات کے لیے امورِ اطاعت میں صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اب ظاہر ہو گیا کہ ہر آیت کا تتمہ اس کے اپنے حال کے مناسب ہے اور ایک آیت کے تتمہ کو دوسری آیت کی جگہ نہیں لگایا جا سکتا۔ واللہ اعلم!

(۱۳) آیت ۴۸:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾

''اُس دن سے ڈرتے رہو جب کوئی کسی کو نفع نہ دے سکے گا اور نہ کوئی سفارش قبول ہو گی اور نہ کوئی فدیہ لیا جائے گا۔''

پھر آیت ۱۲۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾

''اُس دن سے ڈرو جس دن کوئی نفس کسی نفس کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا' نہ کسی شخص سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا' نہ اُسے کوئی شفاعت نفع دے گی۔''

پہلی آیت میں شفاعت (سفارش) کا ذکر پہلے کیا گیا اور دوسری آیت میں اسے مؤخر کر دیا گیا' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی توجیہہ یوں ہو سکتی ہے کہ پہلی آیت سے قبل یہود کو مخاطب کر کے کہا گیا:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (آیت ۴۴)

''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔''

یہاں وہ لوگ جن کو نیکی کی تلقین کی گئی ہے، عین ممکن ہے کہ وہ نیکی کی راہ اختیار کر کے نافرمانی سے بچ جائیں اور اس طرح نجات پا جائیں، یعنی انہیں تو حکم دینے والوں کی بنا پر ہدایت حاصل ہو گئی، گو حکم دینے والے خود اس نیکی پر عمل پیرا نہ ہو سکے، اور پھر قیامت کے دن جب یہ حکم دینے والے اپنی بدعملی کی بنا پر گرفتارِ مصیبت ہوں گے تو کسی کا سہارا ڈھونڈیں گے اور ایسے وقت میں ان کی نگاہیں ان لوگوں کی طرف ہوں گی جو ان کی وجہ سے راہ یاب ہوئے، شاید کہ وہ ان کے کام آ جائیں، شاید کہ وہ ان کی سفارش کر سکیں۔

اسی طرح کی بات منافقین کے ضمن میں بھی کہی گئی کہ قیامت کے دن وہ قیامت کی ہولناکیوں سے نجات پانے کے لیے اہل ایمان کے ساتھ اپنی معیت کا سہارا ڈھونڈیں گے، کہیں گے: ﴿اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ﴾ (النساء: ۱۴۱) ''کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟'' تو اگر منافقین اپنی نجات کے لیے مؤمنین کی معیت کا واسطہ دے سکتے ہیں تو وہ لوگ جو نیکی کا حکم دیتے رہے تھے اور اس حکم کی بنا پر کچھ لوگوں کو ہدایت نصیب ہوئی تھی تو انہیں تو ان ہدایت یافتہ لوگوں سے زیادہ اُمید ہو گی کہ آج وہ ان کے کچھ کام آ سکیں گے، شاید ان کی سفارش کر سکیں گے۔ اس لیے یہاں اس بات کا موقع تھا کہ پہلے سفارش کی نفی کی جاتی کہ آج کے دن خالص ایمان ہی کام آئے گا، سفارش کام نہ آئے گی۔

دوسری آیت سے پہلے چونکہ اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس لیے فدیہ کا ذکر پہلے کیا گیا کہ کسی مصیبت سے نجات پانے کے لیے زرِ فدیہ دے کر جان چھڑانا دنیا میں ایک معروف عمل رہا ہے اس لیے اس کا پہلے ذکر کیا جانا ہی مناسب تھا۔ واللہ اعلم (۱)

(۱۴) آیت ۴۹:

﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ﴾

''اور جب ہم نے تمہیں آلِ فرعون سے نجات دی جو تمہیں بدترین عذاب دیتے تھے، جو تمہارے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے۔''

اور سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴۱)

''اور وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے تمہیں آلِ فرعون سے بچا لیا جو تمہیں بدترین عذاب دیتے تھے، تمہارے

---

(۱) مؤلف کی عبارت یہاں بہت گنجلک ہے اس لیے ساری عبارت کا سادہ مفہوم بیان کر دیا گیا ہے۔

بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔''

دونوں سورتوں میں مضمون ایک ہی بیان ہوا ہے لیکن سورۃ البقرۃ میں لفظ نَجَّيْنٰكُمْ (صیغہ مضاعف) اور سورۃ الاعراف میں ''اَنْجَيْنٰكُمْ'' (غیر مضاعف) لایا گیا۔ اور اوّل الذکر میں يُذَبِّحُوْنَ اور آخر الذکر میں ''يُقَتِّلُوْنَ'' ہے۔

ایک تیسری آیت یعنی سورۃ ابراہیم کی آیت ۶ میں ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ﴾ کہا گیا ہے۔ یہاں يُذَبِّحُوْنَ سے قبل واو العطف لایا گیا جو کہ پہلی دونوں سورتوں میں نہیں ہے۔ اس طرح یہاں تین سوال وارد ہوتے ہیں۔ صاحب ''دُرّۃ التنزیل وغرۃ التاویل'' (الاسکافی) نے ان میں سے دو چیزوں کا ذکر کیا ہے' یعنی يُذَبِّحُوْنَ اور ''يُقَتِّلُوْنَ'' کے مابین فرق کا اور سورۃ ابراہیم میں واو العطف لانے کا' لیکن تیسری چیز سے تعرض نہیں کیا ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل پر کی گئی بے شمار نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر ان کی ناشکری دکھا کر ان کے بداعمال کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ہم بطور تمہید عرض کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کرنے سے پہلے ازل میں انہیں وہ نعمتیں یاد دلائی ہیں جو ان کی خلقت سے پہلے ان کے لیے مہیا کر دی گئی تھیں۔ اور یہ کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے انہیں اعزاز و اکرام سے نوازا اور یہ کہ اس کی رحمت' اس کے غیظ و غضب پر سبقت لے گئی ہے اور یہ کہ وہی تمام احسانات و فیضانات کا منبع ہے اور پھر ان نعمتوں کا تقاضا ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں۔ اسی لیے قرآن کریم کی ابتداء ہی میں ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ اِلٰی قولِہٖ تعالٰی :

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (البقرۃ:۲۱۔۲۲)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یاد دلا رہے ہیں کہ انہیں کیسے عدم سے وجود میں لایا گیا' پھر زمین کو ان کے لیے بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا' پھر آسمان سے پانی برسا کر ان کے لیے پھل مہیا کیے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر یہ سارے احسانات کیے' حالانکہ اسے ایسا کرنے کی کوئی حاجت نہیں تھی' اور پھر انہیں اسی کی عبادت کرنے کی طرف بلایا۔ یہی بات تمام رسولوں سے بھی کہی گئی۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا:

﴿وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ ؕ﴾ (ابراھیم:۵)

''اور انہیں اللہ کے دن یاد دلاؤ۔'' یعنی اس کی نعمتیں اور احسانات۔

اور اسی انداز میں بنی اسرائیل سے خطاب کیا گیا۔ یعنی نعمتیں یاد دلانے کے بعد اللہ کی عبادت کی طرف بلانا' رسول کی تصدیق کرنا اور ایمان پر عہد و میثاق لینا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ (آیت ۴۷)

''اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی تھی۔''

تمہارے اجمالی ذکر کیا اور اس کے بعد تفصیل سے بتایا کہ کیسے تمہیں سمندر پھاڑ کر آلِ فرعون سے نجات دلائی اور

کیسے تمہارے دشمن کو غرق کیا۔ پھر انہیں یاد دلایا کہ باوجودیکہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت کی‘ ان کی توبہ کو قبول کیا‘ انہیں معاف کیا اور جب ان کے مطالبہ رؤیت باری تعالیٰ کے نتیجہ میں ان پر موت طاری کی گئی تو پھر دوبارہ انہیں زندہ کیا گیا‘ اور پھر جب وہ سخت دھوپ کی شکایت کر رہے تھے تو ان پر بادلوں کا سایہ کیا۔ اب ملاحظہ کریں کہ لفظ ’’نَجَّیْنَاکُمْ‘‘ صیغہ تضعیف کے ساتھ لانا کتنا برمحل ہے‘ ان بے شمار نعمتوں کے بیان کے بعد جو انہیں عناد و مخالفت سے روکنے کے لیے یاد دلائی گئیں۔ اور اگر یہاں صرف ’’اَنْجَیْنَاکُمْ‘‘ کہا جاتا تو سیاق و سباق کے ساتھ اس کی مناسبت نہ ہوتی۔ اور یہ بھی ملاحظہ ہو کہ ’’نَجَّیْنَاکُمْ‘‘ (صیغہ تضعیف کے ساتھ) اگلے لفظ یُذَبِّحُوْنَ سے بھی مناسبت رکھتا ہے کہ وہ بھی صیغہ تضعیف کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ یہاں لفظ ’’اَنْجَیْنَاکُمْ‘‘ (بغیر صیغہ تضعیف) کسی طرح بھی مناسب نہ تھا‘ نہ ہی سیاقِ کلام کے اعتبار سے اور نہ ہی معنی کے اعتبار سے۔

دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ ’’ذبح‘‘ کا لفظ ’’قتل‘‘ کی صفت کو بیان کر رہا ہے‘ کیونکہ قتل تو صرف زندگی کو قاتل کے ہاتھ سے ختم کرنے کا نام ہے‘ اور ’’ذبح‘‘ اس کیفیت کا نام ہے جس سے یہ قتل واقع ہوا۔ یہاں ایجاز و اختصار مقصود تھا۔ اگر ’’قتل‘‘ کا بھی ذکر ہوتا اور اس کے بعد ذبح کا‘ تو پھر ایجاز کہاں رہا؟ ’’یُذَبِّحُوْنَ‘‘ کہہ کر مقصود واضح ہو گیا۔ اب چونکہ سورۃ البقرۃ میں صفت قتل کا بیان ہو چکا تو سورۃ الاعراف میں‘ جہاں ان ساری نعمتوں کا بیان نہیں ہوا‘ صرف ’’قتل‘‘ کا بیان ہوا۔ یعنی دونوں سورتوں میں جو لفظ مناسب تھا وہی لایا گیا۔ واللہ اعلم!

تیسرا سوال یہ تھا کہ برخلاف سورۃ البقرۃ اور سورۃ الاعراف‘ سورۂ ابراہیم میں یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کے بعد واو العطف لایا گیا اور کہا گیا: ﴿وَیُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ﴾۔ اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس سورت میں چند رسولوں کا بیان ہوا ہے‘ لیکن انتہائی اجمال اور اختصار کے ساتھ۔ یہاں وہ تفصیل بیان نہیں کی گئی جو دوسری سورتوں میں بیان کی گئی۔ یہ دو طرح کے اسلوب ہیں جو عربوں میں بھی خوب معروف و مشہور ہیں۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے: ؎

یَرْمُوْنَ بِالْخُطَبِ الطِّوَالِ وَ تارةً   وَحْیَ الْملاحِظِ خِیفَةَ الرُّقباء

’’کبھی تو لمبے لمبے خطبوں سے چاند ماری کرتے ہیں اور کبھی رقیبوں کے ڈر سے آنکھوں کے اشاروں ہی سے کام لے لیتے ہیں۔‘‘

کتاب الٰہی میں بھی یہ دونوں اسلوب نمایاں ہیں۔ دیکھئے کہ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں پانچ اقوام یعنی قومِ نوح‘ قومِ ہود‘ قومِ صالح‘ قومِ لوط اور قومِ موسیٰ ؑ کے قصے بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں‘ لیکن یہی پانچ قصے سورۃ القمر میں انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ سورۂ ابراہیم میں بھی ایجاز و اختصار کا اسلوب اپنایا گیا۔

﴿اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ (آیت ۹)

’’کیا تمہارے پاس نہیں آ چکی ہیں خبریں ان لوگوں کی جو تم سے پہلے تھے‘ یعنی قومِ نوح اور عاد اور ثمود!‘‘

اور پھر آیت ۱۴ تک یہ سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ایجاز کے ساتھ وعید کا بھی ذکر ہے۔

ان آیات سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ان دونوں اغراض (ایجاز اور وعید) کا خیال رکھا گیا ہے۔ شروع میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ اَنۡجٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ وَیُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۶)

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اس نعمت کو یاد کرو جو اللہ نے تم پر کی ہے جب اُس نے تمہیں نجات دی آلِ فرعون سے، وہ تمہیں بدترین عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھے، اور وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کر رہے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔''

اب دیکھئے کہ صرف ایک جملے ''یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ'' سے اُن تمام تکالیف کی طرف اشارہ ہو گیا جو آلِ فرعون نے بنی اسرائیل کے لیے روا رکھی تھیں، یعنی بیگار میں لگایا جانا، مشقت آمیز کاموں میں لگانا، انہیں ذلیل کرنا، بیٹوں کو قتل کرنا، عورتوں کو باقی رکھنا وغیرہ۔

اور پھر ان تمام تکالیف میں سب سے تکلیف دہ چیز کو خاص طور پر بیان کیا گیا یعنی بیٹوں کا ذبح کرنا۔ گو وہ ''بدترین عذاب'' میں شامل تھا لیکن اس کی شدت اور شناعت کی بنا پر خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک عام چیز کو پہلے بیان کیا جائے اور پھر ان تمام عام چیزوں میں سے ایک چیز کا بطورِ خاص بیان کیا جائے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو، فرمایا:

﴿مَنۡ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ﴾ (البقرۃ:۹۸)

''اور جو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا دشمن ہے''

پھر خاص طور پر دو فرشتوں کا ذکر فرمایا: ﴿وَجِبۡرِیۡلَ وَمِیۡکٰلَ﴾ ''اور جبرائیل اور میکائیل کا'' —— یہ دونوں بحیثیت عمومی تمام فرشتوں میں داخل تھے لیکن ان کی قدر و منزلت ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر ان کا الگ سے ذکر کیا گیا۔

یہی بات ہے جسے ہم سورۂ ابراہیم میں دکھانا چاہتے ہیں۔ اب ایک آخری بات کہ سورۃ البقرۃ میں وارد ﴿یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ﴾ کا اعراب کیا ہو گا تو اسے پچھلے فعل کا بدل بھی قرار دیا جا سکتا ہے یا اسے استیناف (کلام کو دوبارہ شروع کرنا) بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ گویا یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ بدترین عذاب کیا تھا؟ تو جواباً کہا گیا: وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کیا کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک استیناف قرار دینا زیادہ بہتر ہے، اور باقی آیتوں میں پھر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

(۱۵) آیت ۵۸۔۵۹:

﴿وَاِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃَ فَکُلُوۡا مِنۡہَا حَیۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ نَّغۡفِرۡ لَکُمۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ وَسَنَزِیۡدُ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَیۡرَ الَّذِیۡ قِیۡلَ لَہُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۵۹﴾﴾

’’اور جب ہم نے تم سے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور جو کچھ جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور حِطَّةٌ (ہمارے گناہ معاف کر دے) کہو، ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ عطا کریں گے۔ پھر ان ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی بدل ڈالا تو ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل کیا۔‘‘

اور سورۃ الاعراف (آیت ۱۶۱۔۱۶۲) میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۶۱ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝۱۶۲﴾

’’اور جب ان سے کہا گیا کہ تم اس آبادی میں جا کر رہو اور کھاؤ اس جگہ سے جہاں تمہیں رغبت ہو اور کہو حِطَّة (ہمارے گناہ معاف کر دے) اور سجدہ کرتے ہوئے دروازے سے داخل ہو، ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے، جو لوگ نیک کام کریں گے انہیں ہم اور زیادہ عطا کریں گے۔ سو بدل ڈالا ان ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی تو ہم نے آسمان سے ایک آفت ان پر بھیجی، اس وجہ سے کہ وہ ظلم کر رہے تھے۔‘‘

یہاں دس سوال وارد ہوتے ہیں:

(۱) سورۃ البقرۃ میں ﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا﴾ اور سورۃ الاعراف میں ﴿وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا﴾ ارشاد فرمایا۔

(۲) البقرۃ میں ﴿فَكُلُوْا مِنْهَا﴾ اور الاعراف میں ﴿وَكُلُوْا﴾

(۳) البقرۃ میں ﴿رَغَدًا﴾ اور الاعراف میں یہ لفظ موجود نہیں۔

(۴) البقرۃ میں ﴿ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ اور الاعراف میں ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾

(۵) البقرۃ میں ﴿نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ﴾ اور الاعراف میں جمہور (ماسوائے ابی عمرو اور ابن عامر) کی قراءت کے مطابق ﴿خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ﴾ جو کہ جمع سالم ہے۔

(۶) البقرۃ میں ﴿وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور الاعراف میں ﴿سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(۷) الاعراف میں ﴿مِنْهُمْ﴾ کا اضافہ جو کہ البقرۃ میں نہیں ہے۔

(۸) البقرۃ میں ﴿فَاَنْزَلْنَا﴾ جبکہ الاعراف میں ﴿فَاَرْسَلْنَا﴾

(۹) البقرۃ میں ﴿عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ اور الاعراف میں صرف ﴿عَلَيْهِمْ﴾

(۱۰) البقرۃ میں ﴿بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ اور الاعراف ﴿بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ﴾

اب ان کے جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) شہر میں داخل ہونے کا حکم اور وہاں بسنے کا حکم دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ گو بعد میں جو باتیں بیان ہوئیں ان

سے شہر میں داخل ہونے کے ساتھ وہاں رہنے کا بھی اشارہ ملتا ہے' لیکن یہ ''داخل ہونے'' کے مفہوم میں صریح طور پر شامل نہیں ہے۔ الاعراف کی آیت نے اس اشارے کو کھول دیا اور وہاں داخل ہونے کی غرض و غایت کو واضح کر دیا اور اس طرح دونوں مقامات سے پوری طرح بات واضح ہوگئی۔

(۲) ''فَكُلُوْا'' میں فاء' تعقیب کے لیے ہے یعنی پہلے دخول ہوگا اور اس کے بعد ہی کھانا پینا ہو سکتا ہے' جو نہ ہی دخول سے پہلے ہو سکتا ہے اور نہ ہی دخول کے ساتھ ساتھ بلکہ معاً بعد میں ہوگا۔ اس لیے یہاں حرف ''فاء'' کا لانا بالکل مناسب تھا۔ سورۃ الاعراف میں حرف ''واؤ'' لایا گیا کہ اس سے قبل ''سکونت'' کا حکم دیا گیا تھا۔ کھانا پینا سکونت اور معیشت کے لوازم میں سے ہے لیکن اس کے فوراً بعد ہونے کے لیے لازم نہیں ہے۔ اس لیے یہاں ''واؤ'' کا لانا ہی بہتر تھا۔

(۳) سورۃ البقرۃ کھانے کے ساتھ ''رَغَدًا'' یعنی ''خوب فراوانی کے ساتھ'' کا لفظ لایا گیا جبکہ الاعراف میں یہ لفظ موجود نہیں۔ اور یہ اس لیے کہ سورۃ البقرۃ کے سیاق میں ایسی کوئی بات نہیں بیان ہوئی جس سے ''رَغَدًا'' کا مفہوم خود بخود ظاہر ہوتا ہو' لیکن سورۃ الاعراف میں جہاں سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا' یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں انسان اقامت اختیار کرے گا وہاں کھانا پینا بھی ہوگا اور فراوانی کے ساتھ ہوگا' اور چونکہ یہاں ان پر انعامات اور احسانات کا تذکرہ بھی مقصود ہے اس لیے ''رَغَدًا'' کو علیحدہ سے ذکر کرنے کی حاجت نہیں تھی۔ سیاقِ آیات (یعنی جہاں اقامت کا حکم دیا جا رہا ہے) کا بھی تقاضا ہے کہ یہاں رزق کی فراوانی ہی مراد ہو سکتی ہے نہ کہ تنگی اور قلت۔

(۴) اب رہا سورۃ البقرۃ میں یہ کہنا ﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ اور پھر ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ اور سورۃ الاعراف میں اس کا الٹ بیان کیا جانا تو اس کی توجیہہ یوں ہو سکتی ہے (اور اللہ بہتر جانتے ہیں) کہ ان سے حالت سجود میں حِطَّةٌ کے الفاظ سے ایک دعا کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اگر یہ عبارت دونوں سورتوں میں یکساں ہوتی تو چونکہ ''واؤ'' سے ترتیب کا ہونا لازم نہیں ہے اس لیے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ دونوں اوامر یعنی سجدہ کرنا اور مغفرت کی دعا کرنا علیحدہ علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن دونوں سورتوں میں تقدیم و تاخیر کی بنا پر یہ واضح ہو گیا کہ یہ دعائیہ الفاظ حالت سجود میں مطلوب ہیں' نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد' یعنی یہاں ''واؤ'' معیت کے معنی میں ہے۔ سورۃ البقرۃ میں حالت سجود کا پہلے ذکر ہے اور دعا کا بعد میں' اور یہی فطری ترتیب ہے کہ پہلے انسان سجدہ کے لیے جھکے اور پھر اس کی زبان پر الفاظِ دعا جاری ہوں۔

اس کی مزید وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ فصحاءِ عرب کے نزدیک اگر دو حکم ساتھ ساتھ مطلوب ہوں اور دونوں کے درمیان واو العطف کو لایا جائے کہ جس سے ترتیب لازم نہیں ہوتی' پھر بھی وہ پہلے زیادہ اہم شے کا ذکر کریں گے۔ سیبویہ کہتے ہیں کہ ایسے سیاق میں جہاں دو حکم ساتھ ساتھ مطلوب ہوں وہاں پہلے اُس حکم کو بیان کیا جائے گا جو زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (البقرۃ:۴۳)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔''

اہل ایمان سے یہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں لیکن زیادہ اہم چیز کا پہلے ذکر کیا گیا۔ نیز ارشاد فرمایا:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (آل عمران:۱۳۲)

''اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔''

اور ارشاد فرمایا:

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (النساء:۱۳۶)

''اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر۔''

مزید ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ﴾ (التوبۃ:۶۲)

''اللہ اور اس کا رسول رضامند کرنے کے زیادہ مستحق تھے۔''

اور اس طرح کی بے شمار آیات ہیں' لیکن اس کا اُلٹ ذکر کیا جانا فصیح نہیں قرار دیا جائے گا۔ اور اس وضاحت کی روشنی میں سورۃ البقرۃ میں پہلے سجود کا اور پھر دعا (حِطَّةٌ) کا ذکر سمجھ میں آ جاتا ہے' گو دونوں آیات کے مجموعی ذکر سے ان دونوں احکامات کا ساتھ ساتھ ہونا بھی لازم قرار پاتا ہے۔ واللہ اعلم!

(۵) دونوں سورتوں میں لفظ خطیئة کی جمع ہے جو سورۃ البقرۃ میں فعائل کے وزن پر جمع تکسیر کے صیغے کے مطابق وارد ہوئی ہے۔ فعائل کا وزن جیسے طعینة اور طعائن' سفینة اور سفائن' صحیفة اور صحائف' ایسے ہی خطیئة سے خطایئ بنے گا' جو پھر تصریف کے قاعدے کے مطابق خطایا کی صورت اختیار کرلے گا' جیسے مطیّة کی جمع مطایا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں جمع تکسیر لائی گئی' اس لیے کہ اس سورت میں کثرت سے نعمتوں کا بیان ہوا ہے اور ان کے مقابلے میں پھر خطیئة کی جمع تکسیر سے ان کی خطاؤں کی کثرت کی طرف اشارہ ہو گیا' کیونکہ جموعِ تکسیر سوائے چار اوزان کے (یعنی أفعُل' اِفعال' افعِلة' فِعْلة) غالباً کثرت کے لیے لائی جاتی ہیں' اور سورۃ الاعراف جہاں نعمتوں کا گنوانا مقصود نہیں ہے وہاں خطیئة کی جمع الف اور تاء تانیث سے لائی گئی' کیونکہ ایسی جمع غالباً قلت کی طرف اشارہ کرتی ہے' اِلا یہ کہ اس کے ساتھ ایسا قرینہ موجود ہو جو کثرت پر دلالت کرے۔ یوں دونوں سورتوں سے اس لفظ کی مناسبت ظاہر ہو گئی۔ واللہ اعلم۔

(۶) سورۃ البقرۃ میں ''واوٗ'' کا اضافہ ﴿وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

چونکہ سورۃ البقرۃ میں ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ سے نعمتوں کا بیان شروع ہوا ہے اس لیے کثرتِ احسانات کی مناسبت سے ''واوٗ'' کا اضافہ بھی مناسب تھا' لیکن سورۃ الاعراف میں چونکہ اس طرح کا بیان نہیں تھا اس لیے زائد ''واوٗ'' لانا بھی مناسب نہ تھا۔

(۷) الاعراف میں ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ ارشاد ہوا' یعنی الاعراف میں جہاں ''مِنْهُمْ'' کا اضافہ ہے جو سورۃ البقرۃ میں نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے (واللہ اعلم) کہ لفظ ''ظَلَمُوْا'' ایک عام لفظ ہے جس میں تخصیص ہو سکتی ہے جو یا تو عقلی دلیل کی بنا پر ہو گی یا سمعی دلیل کی بنا پر

اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ ایک بڑی جماعت یا ایک امت کو اگر کوئی حکم دیا جائے یا کسی بات سے روکا جائے تو اس جماعت کے سارے افراد اس حکم کے قبول کرنے میں برابر نہیں ہوں گے‘ کچھ کریں گے کچھ نہیں کریں گے۔ خود اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَاَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ﴾ (آل عمران)

’’ان میں مؤمن بھی ہیں لیکن اکثر فاسق ہیں۔‘‘

اور یہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ (آل عمران:۱۱۳)

’’اہلِ کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو (سیدھے راستے پر) قائم ہیں۔‘‘ اور ایسی دوسری آیات۔

چنانچہ اگر آپ مذکورہ آیت پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہاں عموم مراد نہیں ہے‘ یعنی کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے ظلم نہیں کیا ہوگا۔ سورۃ الاعراف میں ’’مِنۡهُمۡ‘‘ لا کر اس بات کو واضح کر دیا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت سے جو عموم ظاہر ہوتا ہے‘ ایسا نہیں ہے‘ بلکہ اس میں تخصیص واقع ہوئی ہے۔ یعنی ان میں کچھ لوگ تھے جنہوں نے ظلم کیا تھا اور اس تخصیص کی بنا پر سورۃ البقرۃ میں صرف ظلم کرنے والوں پر عذاب نازل کرنے کا ذکر کیا گیا۔ حالانکہ ﴿فَاَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ﴾ بھی کہا جا سکتا تھا‘ لیکن پھر سب کے سب عذاب میں شامل ہو جاتے۔ گویا سورۃ البقرۃ میں ﴿فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا﴾ کہہ کر گروہِ ظالمین کو خاص کر دیا گیا اور سورۃ الاعراف میں ’’مِنۡهُمۡ‘‘ کہہ کر ان کے خاص ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔

(۹٫۸) اب دیکھئے کہ سورۃ الاعراف میں ﴿فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ﴾ کے الفاظ ہیں‘ یعنی ہم نے ان پر آسمانی عذاب بھیجا۔ گو ’’اَرۡسَلۡنَا‘‘ میں تعمیم پائی جاتی ہے لیکن چونکہ اس سے قبل صرف ظالمین ﴿الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ﴾ کی طرف خصوصی اشارہ ہو چکا ہے اس لیے ’’اَرۡسَلۡنَا‘‘ سے عموم نہیں سمجھا جائے گا۔ سورۃ البقرۃ میں تو ﴿فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا﴾ ارشاد فرما کر ویسے ہی صاف صاف بیان کر دیا گیا تھا کہ یہ عذاب صرف ظالموں پر نازل کیا گیا تھا۔ یہاں تک آٹھویں اور نویں سوال کا بھی جواب ہو گیا۔

(۱۰) اب رہ گئی آخری بات کہ سورۃ البقرۃ میں آیت کا اختتام ﴿بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ﴾ پر اور سورۃ الاعراف میں ﴿بِمَا كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ﴾ پر ہوا ہے تو اس کی وجہ (واللہ اعلم) یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے پہل بنی اسرائیل کی ایک ناشکری کی طرف اشارہ کیا گیا تھا‘ جس کو ظلم سے تعبیر کیا گیا تھا‘ اور ظلم کے بھی چھوٹے بڑے کافی مراتب ہو سکتے ہیں‘ اس لیے جب ان کی مزید نافرمانیاں ظاہر ہوئیں تو پھر ان کے لیے ’’فسق‘‘ کا لفظ استعمال کیا گیا جو ’’ظلم‘‘ سے کچھ بڑھ کر ہے۔ ملاحظہ ہو کہ یہ لفظ شیطان ابلیس کے لیے استعمال ہوا جب اس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی۔ ارشاد فرمایا:

﴿اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ كَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الکہف:۵۰)

’’سوائے ابلیس کے‘ جو کہ جنوں میں سے تھا‘ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔‘‘

اور پھر اسے ایمان کی ضد قرار دیا:

﴿اَفَمَنۡ كَانَ مُؤۡمِنًا كَمَنۡ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسۡتَوٗنَ ﴾ (السجدة)

''کیا وہ جو مؤمن ہے فاسق کی مانند ہو سکتا ہے' یہ برابر نہیں ہو سکتے۔''

ظلم کا اطلاق تو کم سے کم تر گناہ پر بھی ہو سکتا ہے' جیسے کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ﴾(النساء:١١٠)

''اور جو شخص برائی کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت چاہے۔''

اور ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ﴾

(آل عمران:١٣٥)

''اور وہ لوگ جو کہ جب بھی بدکاری کریں یا اپنے نفس پر ظلم کریں' اللہ کو یاد کرتے ہیں اور پھر اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہیں۔''

اور چونکہ ظلم کا اطلاق چھوٹے بڑے بہت سے گناہوں پر ہوتا ہے' اس لیے جہاں شرک کا ذکر آیا تو اس کے ''عظیم'' ہونے کے وصف کے ساتھ بیان کیا گیا۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ﴾ (لقمٰن)

''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

اب دیکھئے کہ ایک شخص جو کسی دوسرے شخص کے خلاف حاکم کے پاس شکایت لے کر آیا ہے اور وہ شکایت چاہے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو' وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ آدمی ظالم ہے (چاہے اُس نے رائی برابر ہی ظلم کیا ہو) اور ایسا کہنے میں اُس پر کچھ لازم نہ آئے گا' لیکن اگر وہ معمولی سی کسی بات پر فاسق کہہ ڈالے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔

اور جس طرح ''احسان'' کی جزاء کے بھی درجات ہیں' اسی طرح گناہوں کے بھی مراتب ہیں' اور اس کی مزید وضاحت سورۃ المائدۃ کی ان آیات کے حوالہ سے ہوگی جہاں اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ نہ کرنے کو پہلے کفر سے' پھر ظلم سے اور پھر فسق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس تمہید کے بعد ملاحظہ ہو کہ سورۃ البقرۃ میں جہاں بنی اسرائیل سے خطاب شروع ہوتا ہے اور انہیں نعمتیں یاد کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور پھر جہاں انہیں یاد دلایا گیا کہ کیسے بادل ان پر سائبان کی حیثیت سے تنے گئے اور پھر ان کی ناشکری کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا:

﴿وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴾ (الاعراف)

''انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا' لیکن وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔''

اس کے بعد ان کی ایک اور بڑی نافرمانی کا ذکر کیا کہ جو بات انہیں کہنے کے لیے حکم دیا گیا تھا انہوں نے اس بات ہی کو بدل دیا اور اس کے فوراً بعد ارشاد فرمایا:

﴿فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴾ (البقرۃ)

''تو ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل کیا۔''

اور اس طرح ان کی تمام نافرمانیوں کے اختتام پر ان کے اعمال کو فسق سے تعبیر کیا گیا اور اس کے بعد پھر ایسی کسی سزا کا ذکر نہیں ہے جس کے ساتھ اس کی علت کو بھی بیان کیا گیا ہو۔ سورۃ الاعراف میں بھی اسی طرح کی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے‘ یعنی سب سے پہلی نافرمانی کے بعد ’بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ‘‘ کہا گیا۔

پھر اصحابِ سبت کا قصہ بیان ہوا‘ فرمایا:

﴿وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ﴾

’’اور ان سے اس بستی کا حال پوچھئے جو سمندر پر واقع تھی۔‘‘

اور پھر ان کی نافرمانی کے ذکر کے بعد فسق کا ذکر کیا:

﴿كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴿۱۶۳﴾﴾ (الاعراف)

’’اور اس طرح ہم ان کی آزمائش کیا کرتے تھے بسبب اس کے کہ وہ لوگ فسق کا ارتکاب کرتے تھے۔‘‘

اور یوں دونوں سورتوں میں پہلے ظلم اور پھر ’’فسق‘‘ کا بتدریج ذکر ہوا ہے۔ گویا دونوں سورتوں کے طریق بیان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(جاری ہے)

❁❁❁

ھماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست